اقوال زریں

- غیرت کو غصہ پر ترجیح ہے، اگر تمہیں برے کاموں کے لیے ملامت کی جائے تو غصہ مت کرو، بلکہ غیرت سے کام لے کر اس کو ترک کرنے کی کوشش کرو۔
- مطالعہ اس طرح کرو کہ ہر لفظ کے معنی اور ہر فقرہ کا مطلب مع کل عبارت کے سمجھتے جاؤ، تاکہ یاد رکھ سکو۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا
ROZNAMA RASHTRIYA SAHARA LUCKNOW

جسٹس وشوانا تھن کی تشویش

اظہار رائے

کی آزادی جمہوریت کا ایک اہم پہلو ہے اور اسے بنیادی حق کا درجہ حاصل ہے۔ فی زمانہ انفارمیشن ٹیکنالوجی پر مبنی انٹرنیٹ کے ذریعہ چلائی جانے والی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس نے اظہار رائے کے بے پناہ مواقع اور سہولتیں دستیاب کرا رکھی ہیں۔ ان سہولتوں کی وجہ سے اظہار رائے کی آزادی کے نام پر حق اور سچ کی ترویج و اشاعت کے ساتھ جھوٹ، افترا پردازی، گمراہی، افواہ اور غلط معلومات بھی پھیلائی جارہی ہیں۔ جھوٹی خبروں اور پروپیگنڈے کا مسلسل پھیلاؤ ملک کیلئے ایک سنگین سماجی چیلنج بن گیا ہے اور اس کی وجہ سے سڑکوں پر ہنگامے اور ماب لنچنگ کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی کے نام پر جعلی خبروں اور نفرت انگیز تقریروں کے ساتھ ساتھ سائبر کرائم جیسے ہیکنگ اور فشنگ میں بھی اضافہ ہوگیا۔ غلط معلومات کی وجہ سے انسان کی اخلاقیات اور اقتدار اعلیٰ کے دہانے پر پہنچ چکی ہیں، اب اجتماعی زندگی اور قانون کی حکمرانی کیلئے بھی چیلنج بن رہی ہے۔ کیوں کہ غلط معلومات کو مکمل منصوبہ بندی کے بعد منظم طریقے سے پھیلایا جاتا ہے اور لوگ پلورائز ہوجاتے ہیں اور اس کی بنیاد پر اراکے قائم کرتے ہوئے فیصلے کیے جارہے ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس سوئے استعمال پر سپریم کورٹ کے جج جسٹس کے وی وشوانا تھن نے سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غلط معلومات نے لوگوں کو پلورائز کیا ہے اور معاشرے میں ایک خاص قسم کی رائے ابھارنے کا سبب بن رہی ہیں۔ جسٹس کے وی وشوانا تھن کے مطابق فی زمانہ غلط معلومات سب سے سنگین خطرہ کے طور پر ابھری ہیں اور قانون کی حکمرانی کو سنگین طور پر متاثر کرتے ہوئے یہ ریاست اور اس کے قانونی نظام کو الجھا سکتی ہیں۔

کیرالہ ہائی کورٹ میں منعقد جسٹس ٹی ایس کرشنا موردی ایر یادگاری خطبہ میں جسٹس وشوانا تھن نے کہا کہ ہم ڈیجیٹل دور کے ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں معلومات کا دھماکہ ہے۔ فیس بک، واٹس ایپ اور یوٹیوب جیسے معلومات کے غیر روایتی ذرائع معلومات کو بہت تیز رفتاری سے پھیلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور معلومات اس آن لائن کی وجہ سے ریاست اور قانونی نظام خود کو مخمصے کا شکار پارہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے دیگر معاملات کے علاوہ قانون کی حکمرانی پر بھی شدید اثر پڑ سکتا ہے۔ انہوں نے غلط معلومات کی بنیاد پر بننے والی رائے اور اس کی بنیاد پر کیے گئے فیصلوں کے سلسلے میں متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایسے ایک سنگین مسئلہ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ لوگ اب یہ پوچھ نہیں رہے کہ کیا پارے میں کہ خبریں کہاں سے آرہی ہیں اور انہیں حقیقت اور افسانے میں فرق کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ چند برسوں بعد جب ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ہمارے فیصلوں کی بنیاد غلط معلومات تھیں تو ہم سب کیلئے اس پر یقین کرنا مشکل ہوجائے گا اور معاشرے میں بے اعتمادی کا ماحول پیدا ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے روکنے کی ضرورت پر زور دیا۔

غلط معلومات اور افواہوں سے ہورہے پلورائزیشن کے نتیجے میں بڑھ رہی فرقہ واریت اور انسانیت دشمنی کے اس دور میں جسٹس وشوانا تھن کا اسے روکنے کی ضرورت پر زور دینا حکومت کے سامنے ایک ایسا بھاری پتھر لا کھڑا ہے جسے وہ اٹھانے کے بجائے چوم کر چھوڑ دینے کی عادی رہی ہے۔ سوشل میڈیا بضابطہ اخلاق کی جب بھی بات کی گئی تو حکومت نے سارا نزلہ اپنے مخالفین پر ہی نکالا، ان کے اکاؤنٹس بند کیے، گرفتاریاں اور جیل بھیجا۔ پالیسی ساز اداروں کی اس تجویز کو کئی کثیر پیون میں ڈیجیٹل میڈیا خواتین کی مہم اور اسکولی نصاب میں شمولیت کو اس نے درخور اعتنا نہیں جانا۔ عوام کے پاؤں اور سوشل سوسائٹی کی جانب سے بار بار زور دیے جانے کی وجہ سے اس نے کھلے ہی سوشل میڈیا کے سلسلے میں قانون سازی کا عندیہ دے رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا منشا اس بے لگام طوفان کو یوں ہی جاری رکھنا ہے۔ کیوں کہ غلط معلومات، جھوٹی خبروں اور افواہوں کے زور پر ہی حکومت کا کاروبار چل رہا ہے۔ یہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے کہ مالیہ 2024 کے عام انتخابات میں غلط معلومات، افواہوں اور جھوٹی خبروں نے حکمراں جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کی جیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 90 سے زائد سیٹوں پر بی جے پی کی کامیابی سوشل میڈیا کے ذریعہ پھیلائے جانے والے جھوٹ اور غلط معلومات کی ہی رہین منت رہی ہے۔ اس سے قبل بھی 2019 میں بی جے پی کی کامیابی میں اس سوشل میڈیا، جھوٹی خبروں، افواہوں اور غلط معلومات کا بھاری حصہ رہا تھا۔

جسٹس وشوانا تھن نے مسئلہ کے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی، وہ بجا طور پر سنگین ہیں اور اپنے غلط استعمال کی وجہ سے سوشل میڈیا ایک ایسا ہتھیار بن چکا ہے جو قانون کی حکمرانی کیلئے چیلنج تو ہے ہی، اگر اس پر قابو نہیں پایا گیا تو یہ ملک کی سالمیت اور استحکام کی جڑیں بھی کاٹ ڈالے گا۔ ضرورت ہے کہ حکومت لوگوں کے اظہار رائے اور پرائیویسی کے حق کی خلاف ورزی کیے بغیر سوشل میڈیا کے غلط استعمال کو روکنے کیلئے تمام فریقین کی مشاورت سے نئے آپشنز تلاش کرے۔

edit2sahara@gmail.com

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

محمد حنیف خان

مرکز

میں ہی حکومت سازی کا عمل مکمل ہوچکا ہے۔ بیس کروڑ آبادی والی سب سے بڑی اقلیت کا ایک بھی نمائندہ حکومت میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مرکز میں موجودہ حکومت سے اس طرح کی امید بھی تھی، اس لیے یہ حیرت انگیز بالکل نہیں ہے۔ وزیراعظم نریندر مودی جس طرح سے اپنی ریلیوں میں خطاب کررہے تھے وہ سب ریکارڈ میں ہے اس سے قبل ان کی حکومت نے گزشتہ دس برسوں میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ جس طرح کا رویہ اختیار کیا، وہ بھی سب کے سامنے ہے، ایسے میں حکومت میں نمائندگی نہ دینا کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس پر بحث و مباحثے کی ضرورت ہو۔ البتہ یہ سوال ضرور کیا جارہا ہے کہ اس ایکشن سے ہندوستانی مسلمانوں کو کیا ملا؟ ایکشن سے قبل ان کی نفیات کیا تھی؟ ایکشن کے بعد ان کی نفسیات میں کس طرح کی تبدیلی آئی؟

ان سوالوں کا ایک جملے میں یوں جواب دیا جاسکتا ہے کہ مرکز میں این ڈی اے کی حکومت ضرور بن گئی ہے مگر مسلمانوں کا خوف چلا گیا۔ اس ابھال کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ برطانوی اخبار ڈی گارجین دنیا کے صحافت میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے، اس الیکشن کے ختم ہونے سے قبل 30 مئی 2024 کو اپنا اداریہ بعنوان "Narendra Modi's audacity of hate" (نریندر مودی کی نفرت انگیزی) لکھا تھا۔ اس کا اداریہ الیکشن کے دوران ریلیوں میں کی گئی وزیراعظم کی تقریر اور دیے گئے انٹرویوز کے تناظر میں تھا۔ جب کوئی مسئلہ کسی اخبار کے اداریے کا موضوع بن جاتے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اداریوں میں ایسے ہی مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے جو معاشرے پر بہت زیادہ اثر انداز ہونے والے ہیں۔ اداریے میں لکھا گیا تھا: India's prime minister encourages a belief in his Divinity ,leading flowers to think it is gods purpose to spread fear and loathing یعنی ''ہندوستان کے وزیراعظم اپنی الوہی طاقت ہونے میں یقین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اپنے حامیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ خوف اور نفرت پھیلانا خدا کا مقصد ہے۔'' لیکن الیکشن کے بعد ہوا کیا؟ اس کے بالکل برعکس۔ اس الیکشن اور اس کے نتائج نے یہ ثابت کردیا کہ خوف اور نفرت کے لیے محبت کی اس سرزمین پر کوئی جگہ نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی قلم پچوں کا قومی گیت میں کہا تھا:

رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت ہے جس کی فضا میں جینا

جنت والی فضا کو الیکشن کے دوران مسموم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈی گارجین نے ہندوستانی الیکشن کے رول بک میں درج اصول وضوابط سے اپنے اس اداریے کا آغاز کیا تھا اور لکھا تھا کہ کوئی بھی پارٹی یا امیدوار کسی ایسی سرگرمی میں شامل نہیں ہوگا جو اختلافات کو فروغ دے یا باہمی منافرت کو بڑھاتے یا مختلف ذاتوں اور برادریوں کے درمیان مذہبی یا لسانی کشیدگی کا باعث بنے۔ اس کے بعد وزیراعظم کے حوالے سے استفہامیہ انداز میں لکھا: "Has anyone told Narendra Modi ?Indias Prime Minister has resorted to overtly islamophobic language during the two month campaign, painting ideas 200 million muslims as an existential threat to hindu majority" یعنی ''کیا کسی نے نریندر مودی کو یہ بتایا ہے؟ ہندوستان کے وزیراعظم نے دو ماہ کی مہم کے دوران کھلے عام اسلام مخالف زبان کا استعمال کیا جس نے ہندوستان کے 200 ملین مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے وجود کے لیے خطرہ قرار دیا۔'' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وزیراعظم نریندر مودی نے اپنی ریلیوں کے دوران کس طرح سے زبان کا استعمال کیا اور ان کے مقاصد کیسے تھے مگر انہوں نے اپنی قوم کو یہ بتایا کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں کا شکریہ، جنہوں نے نفرت اور زہریلی سیاست کو مسترد کرتے ہوئے محبت کی سرزمین پر محبت کے ہی گلاب کھلانا پسند کیے۔ اور اسی اخبار نے الیکشن کے نتائج کے بعد 9 جون کو ہنا ایلس (Hanna Ellis) اور پیٹرسن (Petersen) کی رپورٹ بعنوان: 'Indian democracy fought back': Modi humbled as opposition gains ground شائع کی۔ کیا کا آغاز ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ یہ الیکشن نفرت کے سیاست کو مسترد کردیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں بی جے پی کی نفرت انگیز مہم اس کے حامیوں کی سوچ اور ہندوستانی ووٹروں کی خواہش اور ان کے عمل کو واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح سے ووٹروں نے فاشزم اور آمریت کے خلاف ووٹ کرکے جمہوریت کو بحال کیا ہے۔

ان دونوں رپورٹوں کا یہ ذکر اس لیے ضروری تھا کہ

> **وزیر اعظم اور ان کی پارٹی سے متعلق موہن بھاگوت کے گفتگو ان کا اندرونی معاملہ ہوسکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس الیکشن نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہاں کی مٹی میں نفرت کے بیج نہیں اگائے جاسکتے ہیں۔**

انداز ہو کہ دنیا بی جے پی کی سیاست اور یہاں کے عوام کو کس طرح سے دیکھتی ہے۔ جمہوریت جو کیمانیت والی طرز حکومت ہے، اسے گزشتہ دس برسوں کی اکثریت والی حکومت میں کہاں پہنچا دیا گیا تھا اور اس الیکشن کے بعد جمہوریت کی کیا صورت حال ہے۔ ان دونوں رپورٹوں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس الیکشن سے کیا ملا کیونکہ جمہوریت کو آمریت میں تبدیل کرنے کا سب سے بڑا نقصان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کو ہی جھیلنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف مرکزی اور ریاستی حکومتیں قانون سازی کے ساتھ ہی ماورائے قانون اقلیتوں کا ناطقہ بند کررہی تھیں تو دوسری جانب ہر الیکشن کے بعد بی جے پی کے ووٹ میں اضافہ ہورہا تھا جس سے مسلمانوں کے ساتھ ہی یہاں کا انصاف پسند طبقہ بھی کم ہوگیا تھا۔ دوسری جانب بی جے پی اور اس کے حامیوں کی نفسیات تفوق کا شکار ہوکر اس نے یہ مان لیا تھا کہ بی جے پی کو نہیں ہرایا جاسکتا ہے مگر اس الیکشن نے آمریت اور فاشزم کے پرکترے دیے ہیں۔

حکومت سازی کے بعد اگرچہ مسلمانوں کو حکومت میں شامل نہیں کیا گیا لیکن جس طرح کی بیساکھی کے سہارے حکومت سازی کی گئی ہے اور جن سیاست دانوں کے تعاون سے بی جے پی دوبارہ اقتدار میں آئی ہے، اس نے مسلمانوں کے ساتھ ہی انصاف پسند لوگوں کو راحت کی سانس دی ہے۔ چندرا بابو نائیڈو اور بی جے پی کے میونیسٹو کو اگر تقابلی مطالعہ کرلیا جائے یا دونوں کی فکر کو مرکز بنا کر جائزہ لے لیا جائے تو بعد کا منظر قمین نظر آئے گا۔ ایک سے جہاں وعدہ کیا گیا کہ وہ مسلمان کی بھلائی کے لیے کام کرے گا۔ ہر شہر میں عیدگاہ اور قبرستان کے لیے زمینیں مختص کی جائیں گی، اماموں اور مؤذنوں کو سرکاری تنخواہیں دی جائیں گی اور مساجد کو سالانہ بنیاد پر امدادی رقم فراہم کی جائے گی، وہیں دوسرا ایکشن میں یہ کہتا پھر رہا تھا کہ اپوزیشن والے اکثریتی طبقے کی خواتین کے زیورات چھین کر مسلمانوں میں تقسیم کردیں گے۔ اس بعد انتشار قمین کے باوجود دونوں ساتھ آئے اور حکومت سازی ہی۔ اسی طرح اگر تمیش نمارکی فکر اور ان کے ماضی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی سیاست بھی فاشزم سے دور رہی ہے اگرچہ حکومت میں رہنے کے لیے وہ وقتاً فوقتاً بی جے پی کے ساتھ آتے رہے ہیں مگر اپنے قدم پیچھے کھینچنے پر آگے بڑھ جانے میں انہوں نے کبھی بھی کچھ پاپ سے کام نہیں لیا ہے۔ ایسے میں ان دونوں بیساکھیوں کے سہارے حکومت کتنے دن چلے گی یا پھر وزیراعظم نریندر مودی پہلے کی طرح فیصلے کرپائیں گے یا نہیں؟ کشش وچ کی یہی کیفیت دراصل وزیراعظم نریندر مودی کی مجبوری ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس الیکشن نے بی جے پی کے غرور کو خاک میں ملا دیا ہے، جس کی جانب خود آر ایس ایس کے چیف موہن بھاگوت نے بھی گزشتہ دنوں اشارہ کیا۔ وزیراعظم اور ان کی پارٹی سے متعلق موہن بھاگوت کی گفتگو ان کا اندرونی معاملہ ہوسکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس الیکشن نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہاں کی مٹی میں نفرت کے بیج نہیں اگائے جاسکتے ہیں۔ یہ محبت کی سرزمین تھی اور محبت کی ہی سرزمین رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت میں عدم شمولیت کے باوجود سب کی سب سے بڑی اقلیت اور انصاف پسند اکثریت عوام کے فیصلے سے خوش ہیں اور دنیا میں بھی ہندوستانی ووٹروں کی تعریف ہو رہی ہے کہ انہوں نے فاشزم کا بیک فٹ پر پہنچنے پر مجبور کردیا۔

haneef5758@gmail.com

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کیلئے کوششیں

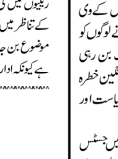

ڈاکٹر جاوید عالم خان

1947

میں جب ملک آزاد ہوا، اس وقت ملک میں خواندگی کی مجموعی شرح صرف 8 فیصد تھی جو 2011 میں اضافہ کے ساتھ 74 فیصد کے آس پاس تھی، اس میں خواتین اور مردوں کی شرح بالترتیب 82 اور 65 فیصد تھی جبکہ مسلمانوں میں یہ شرح 68 فیصد تھی، وہیں عیسائیوں میں 85 فیصد تھی۔ مسلمانوں میں شرح خواندگی دلت اور قبائلیوں کے مقابلے کم ہے۔ آزادی کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی کوششوں کی وجہ سے شرح خواندگی میں اضافہ ہوا ہے لیکن مختلف طبقات کے درمیان ابھی بھی عدم مساوات موجود ہے، پسماندہ طبقات جیسے دلت اور قبائلیوں کے لیے مرکزی حکومت نے تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے ریزرویشن کی پالیسی کو نافذ کیا جبکہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے (سوائے چند ریاستوں کے) اس طرح کی کوئی ریزرویشن پالیسی تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے، البتہ آئین کے آرٹیکل 29 اور 30 کے ذریعہ اقلیتوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کا قیام کریں اور ان اداروں کو چلانے کے لیے ہر طرح سے آزادی دی گئی۔ 2005 میں نیشنل کمیشن فار ایکٹرل ایجوکیشن انسٹیٹیوشن (NCMEI) کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اقلیتوں کے ذریعہ قائم کیے گئے تعلیمی اداروں کو اقلیتی حیثیت دینا تھا۔ اس ادارے نے بڑے پیمانے پر اقلیتی اداروں کو تسلیم کیا اور ان کو قانونی حیثیت دی جس سے یہ اقلیتی ادارے حکومت کے زیر تعلیم سے متعلق چلائی جاری تمام اسکیموں کا فائدہ اٹھا سکیں۔

تعلیمی نظام کو مضبوط کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے چار قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا۔ پہلی قومی تعلیمی پالیسی کا نفاذ 1968 میں کیا گیا اور بعد میں 1986 اور 1992 میں بھی قومی تعلیمی پالیسی کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ 2020 میں ایک اور قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ تمام قومی تعلیمی پالیسیوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دیہی علاقوں میں رہنے والے پسماندہ دلت، قبائلی بچوں اور بچیوں پر خاص توجہ دی جائے گی، اس کے علاوہ اقلیتوں کو بھی تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں گے مزید یہ کہ معذوروں کے لیے بھی تعلیم سے متعلق ساری سہولتوں کی فراہمی کو بہتر بنایا جائے گا۔

آئین کے مطابق مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے تین طرح کی فہرست وضع کی گئی تھیں جن کو مرکزی، صوبائی اور متفقہ فہرست (Concurrent List) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تعلیم کو صوبائی فہرست میں رکھا گیا تھا لیکن 1967 میں آئین میں 42 ویں ترمیم کے ذریعہ تعلیم کو متفقہ فہرست کا حصہ بنایا گیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مرکزی اور صوبائی حکومتیں کریں گی لیکن تجربہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے زیادہ تر ذمہ داریاں صوبائی حکومتوں کے پاس ہیں۔ 1968-69 میں کوٹھاری کمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ تعلیم پر مرکز کے جی ڈی پی کی شرح میں 6 فیصد خرچ کیا جائے گا۔ نئی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی اس بات پر زور دیا ہے۔ سال 23-2020 کے اعداد وشمار سے یہ پتا چلتا ہے کہ تمام صوبائی حکومتیں تعلیم پر اپنے بی ایس ڈی پی کا 7.6 فیصد خرچ کررہی ہیں، وہیں مرکزی حکومت جی ڈی پی کی شرح میں 37 فیصد خرچ کررہی ہے۔

تعلیم کے میدان میں مرکزی حکومت نے کئی ساری اسکیموں کی شروعات کی، ان میں ضلع پرائمری ایجوکیشن پروگرام اہم پروگراموں میں سے ایک تھا، بعد میں مرکزی حکومت نے اسی طرز پر سروشکشا ابھیان کا اعلان کیا جس کا مقصد بنیادی تعلیم کو ہمہ گیر بنانا تھا۔ اس کے علاوہ اہم پروگراموں میں کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ، نیشنل پروگرام فار ایجوکیشن آف گرلز ایٹ ایلیمنٹری لیول (این پی ای جی ای ایل)، مڈ ڈے میل اسکیم، مہیلا سمکھیا، راشٹریہ مادھیمک شکشا ابھیان، ماڈل اسکول، ایکارشٹ اور گرلس ہاسٹل بھی شامل ہیں۔ اس وقت مرکزی حکومت سگر شکشا ابھیان کی اسکیم چلا رہی ہے جو سینئر سیکنڈری تک کی تعلیم کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 2009 میں حکومت نے تعلیم کی سہولتوں کو بہتر بنانے اور اس کو عام کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے ذریعہ ایک قانون بنایا جس کا نام مفت اور لازمی تعلیم کا قانون (The Right of Children to Free and Compulsory Education Act, 2009 (RTE)) ہے، اس کے تحت 6 سے 14 سال کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جارہی ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود حکومت تعلیم کے میدان میں اپنے متوقع نتائج کو حاصل نہیں کر پائی ہے۔ جس کی کئی وجوہات ہیں جیسے کہ اسکولوں میں اساتذہ کی کمی، ٹریننگ کے مواقع کی کمی، پانی، ٹوائلٹ، بجلی اور دوسرے بنیادی انفرا اسٹرکچر کی عدم فراہمی شامل ہے۔ جیسا کہ ہمیں پتا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی بڑی تعداد دلت، قبائلی، پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کے طلبا وطالبات کی ہے۔ بنیادی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے طلبا وطالبات کی ایک بڑی تعداد اسکول چھوڑ دیتی ہے اگر کستوربا ودیالیہ اور نودوے ودیالیہ کی تعلیمی کارکردگی کا کام سرکاری اسکولوں سے موازنہ کیا جائے تو ان کی کارکردگی عام سرکاری اسکولوں سے کافی بہتر ہے۔ تجربہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں اسکولوں پر عام سرکاری اسکولوں سے کئی گنا زیادہ بہتر حکومت خرچ کررہی ہے، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے طبقات کی تعلیمی پسماندگی کی اہم وجہ تعلیم پر سرکاری اخراجات کی کمی ہے۔ حکومت کو تمام سرکاری اسکولوں کو کینڈریہ ودیالیہ کی طرح چلانا چاہیے۔

> **مرکزی اور ریاستی حکومتیں اسکولی اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں عوامی سرمایہ کاری کا مزید اضافہ کریں اور داخلوں میں مسلم بچوں اور بچیوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے حساب سے جگہ دیں۔**

تجزیہ

اعلیٰ تعلیم، تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے میدان میں آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے یونیورسٹی، آئی آئی ٹی، آئی آئی ایم اور دیگر اہم تعلیمی اداروں کو قائم کیا لیکن 2000 کے بعد اعلیٰ تعلیم کے میدان میں حکومت نے اپنے سرکاری اخراجات دھیرے دھیرے کم کردیے ہیں اور اس میدان میں نجی اور غیر نجی سرمایہ کاری کو فروغ دے رہی ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کافی مہنگی ہوگئی ہے اور غریب طبقات کی پہنچ سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ اقلیتوں کی تعلیم کے لیے مرکزی حکومت نے وزیراعظم کی 15 نکاتی پروگرام اور ملٹی سیکٹورل پروگرام جیسی پالیسیوں کے ذریعہ بہت کوششیں کی ہیں، ان پر پروگراموں کے تحت مدرسہ جدید کاری اسکیم، اسکالرشپ پروگرام اور اقلیتی اکثریتی اضلاع، بلاک اور ٹاؤن میں اسکول، ہاسٹل، پالیٹکنک اور آئی ٹی آئی کی تعمیر کی گئی ہے لیکن نفاذ کے گزشتہ 17 سالوں کے دوران مسلم طلبا کئی وجوہات کی بنا پر ان اسکیموں کا فائدہ نہیں اٹھا سکے جن میں مثلاً عوام میں ان اسکیموں کے بارے میں بیداری کی کمی ہے جس کی وجہ سے ان کی شرکت ان اسکیموں میں مناسب طریقے سے نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے علاوہ عکومتی سطح پر اسکیموں کے نفاذ میں کافی کمیاں ہیں، سرکاری اداروں کی خراب کارکردگی اور عوام میں انگلش میڈیم اسکولوں کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے گزشتہ 20 سالوں میں بڑی تعداد میں پرائیویٹ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں، اس عمل میں مذہبی، سماجی تنظیموں اور تجارت سے جڑا طبقہ شامل ہوا ہے۔ عیسائی مشنریوں اور آر ایس ایس کے کارکنوں نے بہت پہلے ہی پرائیویٹ اسکول قائم کرنا شروع کردیے تھے جبکہ مسلم مذہبی اور سماجی تنظیموں نے اس کی شروعات کافی دیر سے کی ہے جو ہم بہت سے مدارس مسلم تنظیموں کے ذریعہ چلائے جارہے تھے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال کو اور بہتر بنانے کے لیے کیا جائے جس سے کہ وہ بنیادی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک دوسرے سماج کی برابری کرسکیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہمارے سیاسی ولی رہنما اور غیر سرکاری تنظیموں کو اس کے ساتھ ایڈوکیسی کرنا چاہیے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اسکولی اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں عوامی سرمایہ کاری کا مزید اضافہ کریں اور داخلوں میں مسلم بچوں اور بچیوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے حساب سے جگہ دیں۔ جہاں تک پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو چلانے اور نئے تعلیمی اداروں کو کھولنے کا سوال ہے، اس میں بھی مسلمانوں کی مذہبی و رفاہی تنظیموں اور تاجر طبقہ کو آگے آنا چاہیے۔ مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جارہے تعلیمی اداروں کے مشاہدے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگر مسلم اداروں کا موازنہ دوسری قوموں کے اداروں کے تعلیمی معیار سے کیا جائے تو زیادہ تر مسلم اداروں میں تعلیم کا معیار بہتر نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں معیار تعلیم کی صورتحال اور بھی خراب ہے، اس خراب معیار تعلیم کی وجہ اچھے اساتذہ کی عدم دستیابی اور ان کو بہتر ٹریننگ کے مواقع نہ فراہم کرنا ہے۔ خراب معیار تعلیم اور والدین کی غربت کی وجہ سے 25 فیصد سے زیادہ بچے اسکول چھوڑ دیتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کی طرف نہیں جاپاتے ہیں، اس لیے اب اس کی ضرورت ہے کہ پرائیویٹ اسکولوں کے لیے اساتذہ کے لیے ٹریننگ اور کاؤنسلنگ مراکز کے قیام کے ذریعہ اسکولی تعلیم کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور بچوں اور ان کے والدین کے لیے کاؤنسلنگ کے پروگرام منعقد کیے جائیں، وہیں اس بات پر زور دیا جائے کہ ہمارے غریب بچے اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں شامل ہوں۔

(مضمون نگار اقتصادی امور کے تجزیہ نگار ہیں)

jawedalamk@gmail.com

آئینہ

ہیں مسلسل اک قیامت میں گھرے اہلِ غزہ
اور ظالم ہیں نئی مشقِ ستم کی گھات میں
یا الٰہی سارے مظلوموں کو پہنچے اُن کا فیض
جو دعائیں آج مانگی جائیں گی عرفات میں

ضمیر ہاشمی

انداز حکمرانی کی بابت مشورہ

مکرمی!

اور یہ ''انداز حکمرانی بدلنے کی ضرورت'' سے متفق ہوتے ہوئے عرض ہے کہ نریندر مودی جی نے بہرصورت تیسری مرتبہ متواتر وزیراعظم کے عہدے کا حلف لے تو لیا لیکن سوائے اتفاق، اس بار حکومت کی تشکیل میں بی جے پی کی حلیف جماعتوں کا بھی عمل دخل ہے کیونکہ اکیلے اپنے دم پر بی جے پی صرف 240 سیٹیں ہی حاصل کرپائی جبکہ مطلوبہ جادوئی نمبر 272 تھا۔ تاہم تمام اعزیش وخدشات کے برخلاف مدعی کے موقف میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی کیونکہ کابینہ میں اہم قلمدانوں کی تقسیم حسب سابق ہی رہی مثلاً پارٹی کے سینئر لیڈران میں جناب راجناتھ سنگھ، جناب امت شاہ، محترمہ سیتارمن اور جناب نتن گڈکری کے پاس بالترتیب دفاع، داخلہ، خزانہ اور روڈ ٹرانسپورٹ قلمدان جوں کے توں رہے۔ آنجہ حلیف وخدشات کی فرمائشیں کس طرح پوری ہوئی ہیں، یہ امر فی الوقت تشنۂ انتظار ہے۔ مزید یہ کہ نئی پود پر اور چھتیس گڑھ سے متعلق سرکار کے موقف میں کوئی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا اداریہ کا یہ نیک مشورہ ظرف طلب ہے کہ ملک عزیز میں امن وامان، استحکام اور سالمیت کی خاطر، وقت کا تقاضا ہے کہ وزیراعظم اپنی فہرست پر نظر ثانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظریہ ساز (Ideologue) شری موہن بھاگوت صاحب کے مطابق اپنے انداز حکمرانی میں بھی تبدیلی لائیں اور اپنی سیاسی سطوت اور وقتی مفاد سے اوپر اٹھ کر شورش زدہ علاقوں میں فروغ پا رہے نسلی امتیاز اور فرقہ وارانہ تعدی آگ کو بجھانے کے فوری اقدام کریں اور بھی ملک وعوام کے حق میں بہتر ہوگا۔

اظہر علی خاں - شرافت منزل، کوٹ الان، رامپور-1

قربانی کے گوشت کی تقسیم

مکرمی!

عیدالاضحیٰ کے تہوار کا اصل مقصد قربانی ہے۔ ہر مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق عیدالاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی کرتا ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت بہت مندجانور لاکر اس کو قربان کیے جاتے ہیں۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں کی قربانیوں کو قبول کرے اور ہمیں پل چھلے کی توفیق دے۔ قربانی کرکے گوشت فرج میں اسٹور کرنا مناسب نہیں ہے۔ عیدالاضحیٰ کے تین دن میں قربانی کے باوجود گوشت مستحقین وغربا تک نہیں پہنچ پاتا ہے تو انتہائی غلط بات ہے۔ قربانی کے گوشت کو تقسیم کرنے کے جو احکام ہیں ان پر عمل ضروری ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو دو وقت کی روٹی کھانے کا انتظام بڑی مشکل سے کرپاتے ہیں، پورا پورا سال گزر جاتا ہے انہیں گوشت کھائے ہوئے۔ اللہ پاک کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے ہمیں اس لائق بنایا کہ ہم قربانی کرسکیں۔ ہم تو پورے سال گوشت کھاتے ہیں، قربانی کے گوشت کے اصل حق دار غریب و مسکین ہی ہیں۔

ڈاکٹر حناکوثر - شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی-25

صفائی پر خصوصی توجہ ضروری

مکرمی!

گندگی سے متعدد بیماریاں پھیلنے کا خ